اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاحِ عالم

از جناب حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی

(۲)

آمریت زمانہ قدیم کی مطلق العنان بادشاہت اور جمہوریت کے مجموعہ کا نام آمریت ہے۔ اسلیے یہ دونوں کے معائب کی حامل ہے۔ بادشاہی کے معائب کا اقرار تو اب ہر شخص کو ہے اسلیے انکے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جمہوریت کے عیوب انشاءاللہ آئندہ سطور میں تحریر کیے جائینگے۔ حیرت اُن مدعیانِ عقل و دانش پر ہے جو ایک طرف آمریت کے ایسے مہمل نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف اسکے بھی مدعی ہیں کہ ہم انسانیت کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں۔ اس سے بڑھکر انسانیت کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت خود اپنے ہی جیسے ایک انسان کے ہاتھ میں بالکلیہ اپنی باگیں دیدے۔

چونکہ آمریت عقل اور فطرت کے خلاف چیز ہے اسلیے یہ کبھی معمولی حالات میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اُن غیر معمولی حالات میں پیدا ہوا کرتی ہے جبکہ مصائب کے کسی شدید حملہ نے ایک قوم کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا ہو۔ ایسے موقع پر اگر کوئی ہوشیار آدمی موجود ہوتا ہے تو وہ قوم کی بدحواسی سے فائدہ اٹھا کر عام جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے، امیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے، اور اس طرح توجہات کو اپنے اوپر مرکوز کر کے آمرانہ اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ اسکے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر قوم کے حواس برجا ہو گئے اور اسے سوچنے کی مہلت مل گئی تو اسکی آمریت

ختم ہو جائیگی - یہی وجہ ہے کہ ہر آمر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم ہیجان انگیز کارروائیاں کرتا رہتا ہے تاکہ اسکی قوم کو کبھی سکون قلب کے ساتھ غور و فکر کا موقع ہی نہ ملے، اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے کل ڈکٹیٹروں کی تاریخ خونریزیوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے - اسکا نتیجہ علاوہ خونریزی، بدامنی اور بے اطمینانی کے یہ بھی ہوتا ہے کہ سوسائیٹی میں عقل سلیم کا نشو و نما رک جاتا ہے اور لوگوں میں اسکی صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر سکیں ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جماعت کی فکری ہی نہیں بلکہ اخلاقی زندگی بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے -

علاوہ بریں آمریت کے نظام میں جماعت کا اخلاق شخصی اخلاق کے تابع ہو کر شخصی ہو جاتا ہے اور اس میں صرف آمر کی زندگی کا نمایاں خلق غالب ہو جاتا ہے - حالانکہ قوام تمدن اور مزاج تہذیب کے قیام و بقاء کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف اشخاص کے مختلف اخلاق و اوصاف جماعت میں نشو و نما پاتے رہیں تاکہ جماعت کا اجتماعی مزاج اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے، جماعت زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر سکے، اور اسکا کیرکٹر یک طرفہ (ONE SIDED) ہو کر نہ رہ جائے - تاریخ شاہد ہے کہ آمریت جماعت کو جس سرعت کے ساتھ ایک ناپائدار ظاہری ترقی کی طرف لے جاتی ہے اس سے وہ چند زیادہ سرعت کے ساتھ وہ اسکو تنزل و ادبار کی طرف لیجاتی ہے - اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ جماعت کے اجتماعی مزاج کو غیر معتدل بنا کر اسکی اخلاقی و فکری بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے اسیلیے اسکی ترقی ہی اسکے تنزل و ادبار کا سبب بنجاتی ہے - بلکہ درحقیقت اسکی ترقی تنزل بصورت ترقی ہوتی ہے اور اسکا عروج بالکل اُس سُرخی کی طرح ہوتا ہے جو مریضِ دق کے چہرے پر نمایاں ہو جاتی ہے اور تیمار داروں اور خود مریض کو افزائش تندرستی و قوت کا فریب دیتی ہے -

مزید یہ کہ آمر ہمیشہ ایسے افراد کو ابھرنے سے روکتا رہتا ہے جو اپنی قابلیت کی وجہ سے

اسکے مدِ مقابل ہو سکتے ہیں - اس طرح ایک طرف تو افراد میں اپنی فطری قوتوں کو نشو و ترقی دینے کا جذبہ دب جاتا ہے اور دوسری طرف جماعت ایسے اشخاص کی اعلیٰ صلاحیتوں کے فوائد سے محروم ہو جاتی ہے -

جمہوریت دنیا کے سیاسی نظریوں میں جس قدر پرفریب اور پر تلبیس نظریہ جمہوریت ہے اس قدر کوئی بھی نہیں ہے - بظاہر یہ ایک جنت ہے جس میں خوف اور حزن کا نام ونشان بھی نہیں ہے، جس میں شخصی آزادی کی حفاظت ہوتی ہے، جس میں انسانیت کی قدر و قیمت پہچانی جاتی ہے اور جس میں عزت و امارت کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا - لیکن جب اسکے باطن پر نظر کی جائے تو یہ ایک جہنم نظر آتی ہے جس میں تکالیف اور پریشانیاں بھری پڑی ہیں، جس میں انسانیت کو کند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے، جس میں شخصی آزادی کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور جس میں غریب اور کمزور کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے - جمہوریت کے تمام معائب کو یہاں مفصل طور پر بیان کرنا مشکل ہے، مگر اس کی چند نمایاں خرابیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن سے اس فردوس نما دوزخ کی حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے:

(۱) جمہوریت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں اجتماعی ارادہ (General Will) کی فرمانروائی کو تسلیم کیا جاتا ہے - لیکن یہی چیز جمہوریت کی سب سے بڑی کمزوری ہے - اجتماعی ارادہ کسی مستقل اور پائیدار چیز کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک بڑی لوچ دار چیز ہے جو ہر پُر زور چیز سے دباؤ کھا کر اپنی شکل بدل دیتی ہے - اسکو دھوکا دیا جا سکتا ہے، اسکو لالچ دلایا جا سکتا ہے، اس کو مشتعل کیا جا سکتا ہے، اس کو بسا اوقات نہایت معمولی اسباب بھی متغیر کر دیتے ہیں - ایسی غیر مستقل چیز پر جس ریاست کی بنیاد قائم کی جائیگی اس میں استقلال اور پائداری کبھی نہیں پائی جا سکتی -

(۲) اجتماعی ارادہ کا ادبی، اخلاقی اور نفسیاتی تاثیرات سے متاثر ہونا یقینی ہے - ایسی حالت

ہیں ریاست کے لیے کوئی مستقل اخلاقی معیار اور قانون کے لیے کوئی پائیدار، خلاقی بنیاد نہیں رہتی
اگر جمہور کے اندر برے میلانات نشوونما پانے لگیں تو ریاست اور قانون نہ صرف یہ کہ ان کو روک نہیں
سکتے بلکہ وہ اُنکے نفاء، وارتقاء کا ذریعہ بن جاتے ہیں، کیونکہ یہاں ریاست اور قانون دونوں
خود جمہور اور انکے میلانات ہی کے تابع ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ باشندے اگر تباہی کی جانب
ایک قدم چلتے ہیں تو ریاست انکو سو قدم دھکیلتی ہے۔ اس طرح انسانیت کی تباہی و بربادی
کا راستہ مختصر ہو جاتا ہے۔ کل کی تاریخ اور آج کا مشاہدہ اِس چیز کو واضح کرنے کے لیے کافی
ہے کہ بد اخلاقی اور بدکرداری نے جمہوریتوں کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ کس طرح ترقی کی ہے،
جمہوریتوں نے کس طرح انکو ترقی دینے میں امداد و اعانت کی ہے، پھر کس طرح یہ بد اخلاقیاں
قوموں کی تباہی و بربادی پر منتج ہوئی ہیں۔ واقعہ صرف یہی نہیں ہے کہ جمہوریت اخلاق عامہ
کے بگڑ جانے کے بعد ان اخلاق سیئہ کی اشاعت و اعانت کرتی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ
خود جمہوریت اخلاق عامہ کی تباہی و بربادی اور انکی خرابیوں کو وجود میں لانے کا بہت بڑا اور
یقینی سبب ہے۔ اسلیے کہ جمہوریت میں درحقیقت اخلاق کا کوئی مستقل معیار ہی نہیں باقی رہتا
جسکو سامنے رکھ کر جماعت یا افراد میں اخلاقی حس پیدا کی جائے۔ جمہور کی رائے کو اخلاق کا معیار
قرار دیکر یہ امید رکھنا کہ جماعت میں اخلاق حسنہ باقی رہینگے سخت حماقت ہے۔ سوسائیٹی
کی شرم انسان کو باہر اور کھلم کھلا بد اخلاقیوں سے کسی نہ کسی حد تک روک سکتی ہے۔ لیکن
خلوت میں روکنے سے وہ قطعاً قاصر ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ تخلیہ میں بد اخلاقیوں کا ارتکاب
جب ایک معتدبہ جماعت کرتی رہتی ہے تو رفتہ رفتہ بقیہ جماعت بھی اس سے متاثر ہوتی
ہے اور مخالفین کی قوت خود بخود کمزور ہو جاتی ہے۔ آخر کار جمہور کے نزدیک بھی اس فعل
میں کوئی شناعت باقی نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بد اخلاقی خوش اخلاقی بنکر ریاست کی

اعانت و امداد حاصل کرلیتی ہے اور اسکے زیر سایہ پھل پھولکر دوسرے معائب وخبائث کو پیدا کرنیکا سبب بنتی ہے

(۳) جماعتی تعصب اور گروہ بندی جمہوریت کے لیے ایک لازمی وضروری چیز ہے - اس مہلک مرض کا اثر یہ ہوتا ہے کہ حق گوئی وحق پسندی کا وصف لوگوں میں بالکل مفقود ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں قوم کی اخلاقی تباہی یقینی ہے - پھر یہی چیز جماعتی استبداد اور اکثریت کے ظلم تک منتج ہوتی ہے جو نظام جمہوری کی بدترین خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے یورپ میں متعدد جمہوریتیں پاش پاش ہوگئی ہیں -

(۴) قانون سازی کے اختیارات جمہوریتوں میں درحقیقت صرف برسر اقتدار جماعت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر ریاست کی کل جماعتیں قانون بنانے میں حصہ لیتی ہیں - پھر اس برسر اقتدار جماعت میں بھی پارٹی ڈسپلن کا دہانہ ہر ایک کے منہ پر چڑھا ہوتا ہے جسکی وجہ سے حق کا دم انکے حلق میں گھٹ کر نکل جاتا ہے - اسیلیے اول تو اس میں اور آمریت میں کچھ زیادہ فرق باقی نہیں رہتا اور جمہوریت کا نام محض فریب دینے کے لیے لیا جاتا ہے، دوسرے یہ برسر اقتدار جماعت آخر انسانوں کی جماعت ہوتی ہے، فرشتوں کی جماعت نہیں ہوتی، اسیلیے اسکے وضع کیے ہوئے قوانین پر اسکے ذاتی رجحانات وتعصبات کا اثر پڑنا لازمی ہے - ایسی صورت میں عدل وانصاف کا معیار اس جماعت کے مفاد کے علاوہ کچھ نہیں رہجاتا - پھر یہ معیار بھی قطعاً غیر مستقل ہوتا ہے، اسیلیے کہ جب دوسری پارٹی برسر اقتدار آتی ہے تو معیار اور نقطۂ نظر تبدیل ہوجاتا ہے - ان حالات میں شہریوں اور ریاست دونوں کو "امن وعیش" کہاں نصیب ہوسکتا ہے جب کہ ہر وقت "جرس" "بربندید محملہا" کی آواز بلند کررہا ہو -

(۵) طاقتور اور برسر اقتدار جماعت حزب مخالف (Opposition party) کو ہر ممکن طریقہ

سے دبانے کی کوشش کرتی رہتی ہے، اور اسکا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ مخالف پارٹی بھی اول الذکر کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے۔ اس وجہ سے جمہوریتوں میں باہمی تفرقہ کی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی ہے اور اسکا خانہ جنگی تک منجر ہوجانا کچھ بعید نہیں ہوتا۔

(۶) اجتماعی ارادہ چونکہ ایک تغیر پذیر شئے ہے اسلیے جمہوریتیں کبھی مستقل اور پایئدار اصولوں پر نہیں چلتیں بلکہ ان میں تلوّن اور ابن الوقتی کی شان پائی جاتی ہے اجسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دوست ان پر اعتماد کرسکتے ہیں نہ دشمن۔ انکے ساتھ معاملہ کرتے وقت کوئی بھی یہ بھروسہ نہیں کرسکتا کہ آج انکی جو پالیسی ہے کل بھی وہی قائم رہیگی۔

(۷) اگر جمہوریت نظام سرمایہ داری کے ساتھ مخلوط ہو تو یہ ناگزیر ہے کہ حکومت و فرمانروائی صرف سرمایہ دار طبقہ کے قبضہ میں آجائے اور غرباء کی قسمت میں ابدی محکومی و غلامی لکھدی جائے۔ اسلیے کہ جمہوریت میں اقتدار اس جماعت کو حاصل ہوتا ہے جسکے پاس پروپیگنڈے کے ذرائع زیادہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ چیز دولتمندوں کو غریبوں کی بہ نسبت زیادہ میسر ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہمارے اس بیان کی تائید کررہا ہے۔ انگلستان میں جو جمہوریت کی محبت میں درجہ جنون سے بھی آگے بڑھ گیا ہے، محض سرمایہ دار طبقہ کی فرمانروائی ہے۔ اور یہی حال امریکہ اور تمام دوسرے جمہوری ممالک کا ہے۔

(۸) جمہوریت کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اسکے اوپر جس ریاست کی بنیاد رکھی جاتی ہے اسکی پالیسی کا محور صرف معاشیات کو بنانا پڑتا ہے۔ یہ ایک لازمی و ضروری چیز ہے جس سے کسی جمہوریت کو مفر نہیں ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی ارادہ جو جمہوری ریاستوں کا طاغوت مسجود ہے انفرادی ارادوں کے اجتماع سے وجود میں آتا ہے اور انفرادی ارادے جب خدا کی بندگی سے آزاد ہوں تو ان کا منتہائے مقصود صرف مطالبات نفس و بدن کا پورا کرنا ہوتا ہے جو معاشیات

کا سرچشمہ ہے۔ اسلیے ہر جمہوریت اس امر پر مجبور ہے کہ وہ معاشی مسائل کو اولیت واولویت کا درجہ دے اور دوسرے مسائل کو محض انکے تابع سمجھے۔ زندگی کے ہر شعبہ کو معاشیات کے تابع کر دینے کا لازمی و لابدی نتیجہ وہ حیوانیت و بہیمیت ہے جسکا مشاہدہ آج دنیا کے اکثر حصہ میں ہو رہا ہے۔ اخلاقی حس کی موت، خدا سے بے نیازی بلکہ بیزاری، مادہ پرستی کا غلبہ، یہ سب چیزیں اسی شکم پرستی اور عبدیت حرص و ہوس کے ضروری اور لازمی نتائج ہیں جن سے نجات اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ جمہوریت کا وجود دنیا میں باقی ہے اور جب تک معاشیات کے بت کی پرستش اس عالم میں جاری ہے۔ جوزف اسٹالین نے بالکل سچ کہا ہے کہ "لوگوں کو مذہب و روحانیت سے بیگانہ اور متنفر بنانے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ان کو معاشیات کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کر دیا جائے"۔

معاشیات کے اس غلبہ کا دوسرا ضروری اور لابدی اثر یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت کے ساتھ سرمایہ داری کا ناقابلِ انقطاع رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں ہر جگہ نظام سرمایہ داری اور نظام جمہوری ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی ملک میں نظام سیاسی جمہوری ہو اور معاشی نظام سرمایہ داری کے علاوہ کچھ اور ہو۔ اسلیے کہ جمہوریت کے معاملہ میں ذیل کی دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بہر حال ہو گی:

اول یہ کہ جمہوریت کے قیام سے بیشتر نظام سرمایہ داری موجود ہو۔ اس صورت میں یہ یقینی ہے کہ برسر اقتدار جماعت یا تو خود سرمایہ دار ہو گی یا کم از کم سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ہو گی۔ اسکی وجہ ہم سابق میں ذکر کر چکے ہیں اور مشاہدہ بھی اسکی تائید کرتا ہے، چنانچہ انگلستان کے جمہوری نظام میں بینک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹر اور وزیر اعظم کی پوزیشن بالکل یکساں ہے بلکہ دستوری قانون کے ماہرین کی ایک بہت بڑی جماعت ڈائرکٹر کے عہدہ کو وزیر اعظم

کے عہدہ سے اہم تر خیال کرتی ہے - اسی طرح فرانس کے بینک (Banque de France) کا ڈائرکٹر فرانسیسی حکومت پر اس طرح حاوی رہتا ہے کہ حکومت اسکے اشارۂ چشم وابرو کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی - حکومت اگر اس سے نہیں نباہ سکتی تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے - چنانچہ جو لوگ قریبی دور کی فرانسیسی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ فرانسیسی کابینۂ حکومت میں روز روز کے تغیرات وانقلابات کس حد تک اسی بینک کے رہینِ منت رہے ہیں - بلکہ جرمنی کے مقابلہ میں فرانس کی موجودہ بے دست و پائی بھی اسی سرمایہ پرستی کی برکت ہے -

دوسری صورت یہ ہے کہ جمہوریت کے قیام کے وقت نظام معاشی سرمایہ دارانہ نہ ہو بلکہ کوئی اور مثلاً اشتراکی ہو - ایسی صورت میں بھی یہ لازمی ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد نظام معاشی رفتہ رفتہ متغیر ہو کر سرمایہ دارانہ ہو جائے - اسلیے کہ اس صورت میں جو جماعت بھی جمہوریت میں برسرِ اقتدار ہوگی وہ سرمایہ پر پورا قبضہ رکھیگی اور اس میں ایسے تصرفات کریگی جو اسکے مفاد کے مناسب ہوں - اگر شخصی سرمایہ داری نہ بھی ہو تو جماعتی سرمایہ داری تو یقینی ہے جو شخصی سرمایہ داری سے بھی زیادہ مضر ہے - پھر معاشیات سے واقفیت رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جماعتی سرمایہ داری ایک عرصہ کے بعد شخصی سرمایہ داری میں ضرور تبدیل ہو جاتی ہے - اشتراکیت کے گہوارہ روس کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں سرمایہ داری کئی صورتیں بدل کر شخصی صورت میں واپس آگئی ہے -

اس خالص معاشی ریاست وسیاست کے تباہ کن اثرات کا احاطہ مشکل ہے - اس سے جو اخلاقی بربادی ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے - لیکن اسکا ایک نتیجہ عجیب و غریب ہوتا ہے جسکا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا - اور وہ یہ ہے کہ یہ خود اس جمہوریت و ریاست

کی بنیاد بھی کھوکھلی کر دیتی ہے جو اسکو وجود عطا کرتی ہے - قارونیت کا غلبہ انسان سے انسانیت کا جوہر سلب کر لیتا ہے - ایک سرمایہ دار کو صرف سرمایہ عزیز ہوتا ہے، نہ اسکو قوم کی پرواہ ہوتی ہے، نہ ملک کی نہ جماعت کی، اسلیے وطنیت و قومیت کے وہ تصورات جن پر عموماً جمہوریت کی بنیاد قائم ہوتی ہے سرمایہ دار کے ذہن سے قطعاً محو ہو جاتے ہیں، اور وہ ہر اس چیز کی اعانت و امداد کرتا ہے جس سے اسکے سرمایہ کی ترقی و حفاظت ہوتی ہو، خواہ اسکے نتیجہ میں ریاست، ملک، قوم سب تباہ و برباد ہو جائیں - انگلستان کا مشہور اہل قلم جان گنتھر اپنی کتاب "باطن یورپ" (Inside Europe) میں لکھتا ہے "فرانسیسی سپاہی کے سینہ میں جرمنی کی جانب سے جو گولی آکر لگی ہے بہت ممکن ہے کہ وہ فرانس ہی کے کسی کارخانہ کی بنی ہوئی ہو" موجودہ جنگ کے متعلق قریبی زمانہ میں ایک خبر یہ بھی آئی تھی کہ جرمنی نے فرانس کے مقابلے میں جو بھاری ٹینک استعمال کئے تھے ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد خود فرانس کے بنے ہوئے ٹینکوں کی تھی - مسٹر چیمبرلین آنجہانی کی پالیسی جس نے جنگ کو برطانیہ کے لیے اس قدر تباہ کن بنا دیا اور جرمنی کی ہمتوں کو اسقدر بلند کر دیا اسی سرمایہ پرستی کا نتیجہ تھی - پولینڈ کے مقابلہ میں جرمنی کی اسقدر عاجل کامیابی اور پولینڈ کی تباہی کی ذمہ دار بھی اُس کی سرمایہ پرست جماعت ہے جس کو جرمنی کی غلامی میں سرمایہ بڑھانا بہ نسبت آزادی کے زیادہ پسند آیا -

(۹) اجتماع کے وجود میں آنیکے دو سبب ہوتے ہیں: کوئی عقلی اصول جو کل جماعت کا مقصد و مطمح نظر ہو جائے اور یہ مقصد و عقیدہ کی ہم آہنگی پوری جماعت کو متحد و مجتمع کر دے - یا کوئی خاص جذبہ جو افراد میں ہم آہنگی پیدا کر کے ان میں ایک ہیئت اجتماعیہ کو وجود میں لانیکا سبب بنے - جمہوری ریاست میں چونکہ اصول کا معیار خود اجتماع ہے اسلیے اسکے سامنے کوئی

ایسا مستقل عقلی اصول وقانون نہیں ہوتا جو افراد میں ہیئت اجتماعیہ پیدا کرکے جمہوریت کے وجود میں آنے کا سبب بنے۔ لہٰذا یہ لازم آیا کہ اس میں اجتماع کی بنیاد عقلی کے بجائے محض جذباتی ہو جسکے مندرجہ ذیل نتائج یقینی ہیں:

(الف) جماعت میں عقلیت کے بجائے جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے اسکے قوائے عقلیہ روز بروز کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ نہ اسکا فکری نظام صحیح رہتا ہے نہ اخلاقی۔ اور رفتہ رفتہ وہ حیوانیت و بہیمیت کے درجہ پر پہنچ کر فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔

(ب) جذبات میں استقلال نہیں ہوتا اسلیے یہ اجتماع بھی سخت متلوّن اور سیماب وش ہوتا ہے۔ یورپ کی جمہوریتوں میں روز روز کے تغیرات و انقلابات اسکی نظیر میں پیش کیے جا سکتے ہیں یہانتک کہ انگلستان کا ایسا قدامت پسند اور جامد ملک بھی چھوٹے موٹے انقلابات کی آماجگاہ تو بن چکا ہے اور ایک بڑے انقلاب کی جانب بھی قدم بڑھا رہا ہے جیسا کہ وہاں کے ارباب سیاست کے اقوال سے باوجود سعی اخفا معلوم ہوتا ہے۔

(۱۰) جمہوریت میں ایک جماعت محض اس بنا پر دوسری جماعت پر صاحب اقتدار بنادی جاتی ہے کہ وہ ثانی الذکر سے تعداد میں زیادہ ہے۔ یہ چیز جس قدر انصاف و عدل کے خلاف ہے وہ ظاہر ہے۔ عقل سلیم کسی صورت سے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو سکتی کہ محض تعداد کی اکثریت حکمرانی و فرمانروائی کا حق پیدا کر دیتی ہے۔

فتلک عشرۃ کاملۃ۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ صرف ان دس معائب کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ جمہوریت کی خرابیاں اس سے کہیں زائد ہیں۔ اب میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جو "اسلامی جمہوریت" کی لایعنی اصطلاح بڑے زور سے استعمال کیا کرتے ہیں کہ اسی پر از معائب جمہوریت کو آپ اسلام کے سر تھوپنا چاہتے ہیں؟ اور اگر یہ نہیں ہے

بلکہ جمہوریت سے آپ کوئی دوسرا مفہوم مراد لیتے ہیں تو کیا ضرورت ہے کہ آپ اسی لفظ کو اسلام کے ساتھ ملا کر گمراہ کرنے کا سبب بنیں۔ کیا لا تقولوا راعنا الخ کا حکم محض لفظ "راعنا" ہی کے استعمال تک محدود ہے؟ اور کیا یہ تلبیس الحق بالباطل نہیں ہے؟

جمہوریت، آمریت، اشتراکیت وغیرہ یہ سب خالص دنیاوی ریاست (Seculat State) کی قسمیں اور انسانی فرمانروائی (Human Sovereignty) کی مختلف صورتیں ہیں۔ انکو اسلامی ریاست اور خلافت الٰہیہ سے کیا نسبت جسکی بنیاد ہی انسانی حکومت کی نفی اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اثبات ہے۔ اسلیے اسلامی ریاست کی نظیر تلاش کرنا نہ صرف عبث بلکہ سخت گمراہی و ضلال بھی ہے۔ مگر ان مرعوب ماؤف ذہنوں اور دماغوں کو کیا کہا جائے جنھوں نے اسلامی مسائل کی حقانیت کا معیار مغربی خیالات سے انکے انطباق کو قرار دیدیا ہے۔ پھر اس کوشش میں واقعیت وغیر واقعیت سے انکو کیا بحث۔ اسلامی مسئلہ خواہ وہ مغربی اصول سے قطعاً متضاد ہی کیوں نہو، اور مغربی مسئلہ خواہ کتنا ہی لغو و مہمل کیوں نہو مگر انکا تو کام بس اتنا ہے کہ اسلام کو کھینچ تان کر اس پر منطبق کردیں، خواہ اس کوشش میں اسلام کے ٹکڑے ہی کیوں نہ اڑ جائیں۔ اس چیز کا نام انکے نزدیک مغربی سیاست سے واقفیت اور جدید علم کلام میں مہارت ہے۔

میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ بیشک آپکو اسکا حق حاصل ہے کہ اپنا جو مسلک چاہیں اختیار کریں۔ لیکن آپکو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ آپ اپنے ذاتی رجحانات و خیالات کو اسلام کی جانب منسوب کردیں؟ پھر اگر صحیح اسلامی خیالات آپکے نزدیک موجودہ دور میں ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہیں اور آپ کو انکے اظہار سے شرم آتی ہے تو آپ صاف صاف اسلام سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟ اخلاقی جرأت اور دیانت کا اقتضاء تو یہی ہے۔

اگر آپ اسلام سے شرماتے ہیں تو اسلام آپ سے سو بار شرماتا ہے۔ اسکو کوئی پرواہ نہیں خواہ اسکا کوئی پیرو رہے یا نہ رہے۔ وہ خود ایک زندہ حقیقت ہے۔ اسکی زندگی ہمارے وجود کی محتاج نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی اسکے وجود کی محتاج ہے۔ اللہ اللہ مسلمانوں کے علمائ تک کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ اسلامی خیالات کو صحیح صورت میں ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور انکو کفر و ضلال کے ساتھ آمیز کرنا چاہتے ہیں یا ہیں ان سے پھر کہتا ہوں وَلَا تَلْبِسُوا الحق بالباطل و تکتموا الحق و انتم تعلمون ○

غیر جمہوری سرمایہ دارانہ ریاست پر گفتگو اس موقع پر لا حاصل ہے اسلیے کہ اسکی قباحت اظہر من الشمس ہو چکی ہے۔ نیز جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کے قبائح پر جو روشنی ڈالی جا چکی ہے اسکے بعد اس موضوع پر الگ مستقل بحث کی حاجت نہیں۔

اشتراکی ریاست | اسوقت جو غیر اسلامی نظریہ سب سے زیادہ گمراہی کا سبب بن رہا ہے وہ اشتراکیت ہے۔ اسکا اضلال اس حد پر پہونچگیا ہے کہ اب دینِ ابراہیمی و ملت حنیفی کے محافظین تک اسکے شکار ہو رہے ہیں اور بے سوچے سمجھے اس خلاف عقل و نقل نظام کی تائید میں کوشاں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قیامت کے دن، جس پر انکا بھی ایمان ہے، جب ان سے یہ پوچھا جائیگا تو اسکا کیا جواب ان کے پاس ہوگا کہ کیا تم اسلام کو دین کامل نہ سمجھتے تھے؟ پھر کیا اسلام اور کفر کے علاوہ دنیا میں کوئی تیسری چیز بھی تھی؟ پھر جب تم نے اسلام کے سیاسی و معاشی نظام سے روگردانی کر کے ایک دوسرے نظام کو پسند کر لیا تو یہ ترجیح کفر علی الاسلام اور رضا بالکفر تھی یا نہیں؟ پھر رضا بالکفر اور ترجیح کفر علی الاسلام کا حکم تم کیا نہیں جانتے تھے؟ تم خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کی گمراہی کا سبب بنے کیا اسکا انجام تم کو معلوم نہ تھا؟ قسم ہے مالک عرش بریں کی کہ ان سوالات کا کوئی جواب انکے پاس نہ ہوگا۔

اس سے پیشتر میں ترجمان القرآن کے صفحات میں ایک مبسوط مقالہ اشتراکیت پر لکھ چکا ہوں جس میں واضح دلائل سے اس نظریہ کا ابطال کیا گیا تھا، اسلیے یہاں اس پر زیادہ تفصیلی گفتگو کی تو کوئی حاجت نہیں ہے۔ البتہ کچھ مزید دلائل یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ان دلائل کو سمجھنے کے لیے یہ ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ اشتراکیت درحقیقت ایک معاشی نظریہ ہے اور مارکس نے اسکو اسی صورت میں پیش کیا تھا۔ لینن نے اس کی پیشینگوئی کو ایک سیاسی انقلاب کے ساتھ آمیز کرکے اس میں سیاست کی بُو پیدا کردی۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ اس کی سیاسی حیثیت کو ہم کسی حالت میں بھی اسکی معاشی حیثیت سے جدا کرسکیں۔ اسکی سیاسی حیثیت اسکی معاشی حیثیت پر موقوف ہے، اسلیے معاشی حیثیت کے انہدام کے بعد سیاسی حیثیت خود بخود فنا ہوجاتی ہے۔

اشتراکیت محنت و سرمایہ کو ایک ہی طبقہ کی ملکیت میں دیدیتی ہے، اور وہ طبقہ بھی محض جماعتی حیثیت سے سرمایۂ دولت کا مالک ہوتا ہے، ورنہ جماعت کا کوئی فرد حقوق ملکیت نہیں رکھتا بلکہ حکومت اس سے محنت لیکر اسکی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اور وہی کل دولت کی مالک ہوتی ہے۔ اِس صورت حال کا یہ نتیجہ لازمی ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد قانون تقلیل افادہ (Law of diminishing utility) کا عمل شروع ہوجائے۔ اس قانون کے اثرات میں آئندہ سطور میں تحریر کرونگا۔ پہلے اس امر کی وضاحت کرتا ہوں کہ اس قانون کا عمل ہونا کیوں ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ایک اشتراکی ریاست کے ایک مزدور کے متعلق فرض کیجیے، کہ وہ اوسطاً ۸ گھنٹہ روزانہ کام کرتا ہے۔ محنت کی یہ مقدار اسکے لیے حکماً لازمی ہے۔ اور یہ محنت ایسی ہے کہ جس سے اسکی صحت و تندرستی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور حکومت کے لیے اسکا کام کافی مفید ہوجاتا

ہے - ۸ گھنٹہ کی محنت کا معاوضہ حکومت کی طرف سے اسکو یہ ملتا ہے کہ اسکو اسکی ضروریاتِ زندگی مہیا کر دی جاتی ہیں، مثلاً دو وقت کھانا، صبح کو ناشتہ، گرمی و سردی سے بچنے کے لیے کپڑے - ان ضروریات زندگی کو ہم سہولت کے لیے بصورتِ زر فرض کیے لیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اسکو گویا ایک روپیہ روزانہ اجرت ملتی ہے - اب اگر وہ بالفرض ۹ گھنٹہ روزانہ کام کرنے لگے تو بھی اسکو وہی ایک روپیہ روزانہ اجرت ملیگی اسلیے کہ ایک روپیہ کے معنی اسکی ضروریات زندگی کے ہیں، اور ضروریات زندگی محدود ہوتی ہیں، ان میں بڑھنے اور گھٹنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اور اگر ہوتی ہے تو برائے نام جو ناقابلِ اعتبار ہے - اس صورت میں کوئی شخص اس پر رضامند نہ ہوگا کہ ۸ گھنٹے کے بجائے ۹ گھنٹہ محنت کرکے خواہ مخواہ تکلیف اٹھائے لہذا سرمایہ کا وہ حصہ جو محنت کرنیوالوں کی ضروریات زندگی سے زائد ہے بالکل فضول ہوجائیگا اور اسکا افادہ ختم ہوجائیگا اسلیے کہ اسکے معاوضہ میں محنت نہیں حاصل کی جاسکتی، نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے -

اب فرض کیجیے کہ کسی اشتراکی ریاست کی آبادی ۴۰ ہزار افراد پر مشتمل ہے جنکی محنت کا معاوضہ ایک روپیہ فی کس فی یوم کے حساب سے (ع ہ = ایک شخص کی ضروریات زندگی) ۴۰ ہزار روپیہ روزانہ ہے - اور ریاست کی آمدنی مثلاً ۵۰ ہزار روپیہ یومیہ ہے تو یہ ۱۰ ہزار روپیہ یومیہ کی بچت بالکل بیکار اور غیر مفید ہے - اس دولت سے محنت کرنے والوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی اور اسکا افادہ بالکل غائب ہوجائیگا -

اس قانون کے عمل میں آنے کے بعد اشتراکی حکومت ذیل کی دو صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کرسکتی ہے -

پہلی صورت تو یہ ہے کہ وہ اس کل غیر مفید اور زائد از ضرورت دولت کو کل پبلک پر

بحصۂ مساوی تقسیم کر دے۔ اس صورت میں چونکہ مختلف اشخاص کی ضروریات زندگی، نیز اخراجات مختلف ہونگے، کسی کے کم ہونگے اور کسی کے زائد، اسلیے معاشی اعتبار سے مختلف طبقات کا پیدا ہو جانا یقینی و لابدی ہے۔ خصوصاً اسلیے کہ محض ضروریات زندگی سے زائد دولت کا تقسیم کر دینا اس میں افادہ پیدا کرنیکے لیے کافی نہ ہوگا، بلکہ اسکے لیے پبلک کو تجارت کی اجازت دینا بھی ناگزیر ہوگا۔ نیز یہ کہ تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنے کے لیے اسکو زر کی صورت میں تقسیم کرنا پڑے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس زائد از ضرورت دولت کو تقسیم کرنے کے بجائے خزانہ ہی کی زینت بنایا جائے۔ یہ صورت اول تو سخت احمقانہ اور ظالمانہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس صورت حال کو محنتی طبقہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا، اسلیے کہ جب وہ دیکھے گا کہ اسی کی محنت سے مہیا کی ہوئی دولت تجوریوں میں مقفل ہے اور وہ برابر محنت و مشقت میں مصروف ہے تو وہ یقیناً اسکے خلاف بغاوت کریگا۔ ہڑتالیں، کارخانوں کو تباہ کرنے کی کوششیں (Sabotage) اور تعطل کی سازشیں شروع ہو کر ریاست کے امن و امان کو خاک میں ملا دینگی۔ اور اس وقت کسی منطق سے انکو اشتراکیت اور سرمایہ داری کا فرق نہ سمجھایا جاسکے گا۔ نیز اس صورت میں ایک اور خرابی بھی لازم آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس فضول دولت کو محفوظ رکھنے کے لیے ناگزیر ہوگا کہ اسکو زر کی صورت میں تبدیل کیا جائے، مگر ظاہر ہے کہ یہ مبادلہ اشتراکی حکومتوں سے تو ہو نہیں سکتا، اسلیے کہ وہ خود اسی قارونیت کی مصیبت میں گرفتار ہونگی، لہذا سرمایہ دار ممالک اور حکومتوں سے معاملہ کرنا پڑیگا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اشتراکی حکومت کو تو کسی چیز کی خریداری کی احتیاج ہوگی نہیں اسلیے وہ اس زائد از ضرورت دولت کے معاوضہ میں صرف زر حاصل کریگی یا کم از کم زیادہ سے زیادہ مقدار زر طلب کریگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ زر کے یک طرفہ اجتماع سے لازماً دونوں ممالک

میں معاشی توازن بگڑ جائیگا۔

اب ایک دوسری حیثیت سے دیکھیے۔ انسان کی ضروریات زندگی محدود ہیں اور انکو پورا کرنے کے لیے کل آدمیوں کو مصروف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً سو آدمیوں کی ضروریات پوری کرنیکے لیے زیادہ سے زیادہ پچیس آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس طرح کہ مثلاً دس آدمی غذا مہیا کر سکتے ہیں، ایک آدمی گوشت دیسکتا ہے، ایک آدمی انکے کپڑے سی سکتا ہے، ۲ آدمی انکے لیے کپڑا بن سکتے ہیں، ایک آدمی روشنی کا انتظام کر سکتا ہے، ایک چوکیدار انکی حفاظت کا کام انجام دے سکتا ہے، دو آدمی انکے لیے پانی مہیا کر سکتے ہیں، سات آدمی اور متفرقات کے لیے رکھ لیجیے۔ اس طرح صرف پچیس ۲۵ آدمی سو آدمیوں کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ ایسی حالت میں اشتراکی ریاست ان پچہتر فیصدی بیکار اشخاص کے لیے کیا کریگی؟ مجبوراً انکو کام مہیا کرنیکے لیے اسباب تعیش (Luxuries) تیار کرانا ضروری ہونگے اور نہ صرف تیار کرانا ہونگے بلکہ پبلک کو ان کے استعمال کی عادت بھی ڈالنی ہوگی۔ اسکے جو اخلاقی اور نفسیاتی اثرات ہونگے اور یہ جسطرح تباہی و بربادی کی طرف منتج ہوگا وہ بالکل ظاہر ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اشتراکیت کے لیے دو چیزیں لازمی ہیں جو اسکے وجود سے کبھی منفک نہیں ہوسکتیں۔ اول تو قلیل ہی عرصہ میں اس کا سرمایہ داری میں تبدیل ہوجانا۔ دوسرے اس کا اخلاقی و روحانی بربادی پیدا کرنا۔ پس حیرت و افسوس ہے ان اسیران دام اشتراکیت پر جو اشتراکیت کو دنیا کے لیے آیۂ رحمت سمجھتے ہیں اور اسکو رواج دینے کے لیے کوشاں ہیں اور انما نحن مصلحون کے نعرے لگارہے ہیں۔ میں کہتا ہوں " الا انھم ھم المسفدون ولکن لا یشعرون "۔

نظریہ خلافت الٰہیہ ریاست کے غیر اسلامی نظریات مع انکے معائب اور نقائص کے گذشتہ صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ انکے نقائص اور معائب کو دیکھ کر ہر شخص انکے وجود کو دنیا اور اہل دنیا کے لیے ایک مصیبت عظمیٰ اور لعنت کبریٰ سمجھیگا۔ بلاشبہ دنیا کے اوپر جو مصیبتیں آرہی ہیں وہ زیادہ تر انہیں غلط اور غیر اسلامی افکار سیاسی و اصول معاشی کی رہین منت ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کو ان معائب سے نجات دلانیکا عزم کریں اور اسکے لیے اپنی عمر کا ہر لمحہ اور اپنے خون کا ہر قطرہ وقف کر دیں۔ مسلم ہونیکے معنی یہ ہیں کہ ہم نے صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کے احکام کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیا اور صرف اسی کی بادشاہت و سلطنت کو تسلیم کرکے دنیا کے ہر بادشاہ، ہر حاکم، ہر سلطان کی حکومت و سلطنت کی نفی کر دی۔ اسلیے یہ ناممکن ہے کہ ہم مسلم ہوتے ہوئے غیر اللہ کی حکمرانی اور غیر اللہ کی حکومت تسلیم کریں، یا غیر اللہ کے بتائے ہوئے کسی نظام حیات اور کسی اصول زندگی کو قبول کرلیں، یا انکے وجود کو جیتے جی گوارا کرلیں۔ نفی کا اقتضاء یہ ہے کہ ہم ہر غیر اسلامی اور غیر الٰہی حاکمیت و فرمانروائی کو صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹا دیں، اور اثبات کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حکومت اُسکی زمین میں قائم کریں۔ ان دونوں فرضوں میں سے اگر ایک میں بھی کوتاہی ہو تو یقیناً ہم گناہگار اور سخت گناہگار ہیں، بلکہ ہمارے اسلام میں کمی اور کمزوری ہے۔ یقیناً جس طرح غیر اسلامی نظام حیات اور غیر الٰہی حاکمیت و فرمانروائی کا قبول کرنا اور اسکو رائج کرنیکی کوشش کرنا جرم عظیم اور علامت ضعف ایمان ہے، اُسی طرح اسکے خلاف جدوجہد نہ کرنا اور خاموشی و سکوت کے ساتھ اسکو گوارا کر لینا بھی سخت جرم اور بہت بڑا گناہ ہے۔ پھر خلافت الٰہیہ کے قیام اور اس نظریہ کی قبولیت کے لیے وقت بھی موزوں ترین ہے۔ شاید دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا ہے جو خلافت اسلامیہ کی مقبولیت کے لیے موجودہ دور سے زیادہ موزوں و مناسب ہو۔ اسلیے کہ دنیا اس وقت خود

غیر اسلامی نظریات و اصول سے عاجز و پریشان ہے اور بدل متمنی ہے کہ کوئی نیا نظام رواج پذیر ہو کر اسکے مصائب کا خاتمہ کر دے اور اسکو راحت و سکون سے ہم آغوش کرے۔ تحریک اسلام کے لیے وقت کی یہ موزونیت و مناسبت ہماری خاموشی و بے عملی کے جرم کو اور بھی سنگین بنا دیتی ہے۔

مقام حیرت و غیرت ہے کہ ایک نازی بالکل ناسازگار و نامساعد حالات میں اپنے وطن سے باہر جا کر نازی ازم کا پروپیگنڈا کرتا ہے اور کسی نہ کسی حد تک اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ایک اشتراکی سرمایہ پرست ممالک میں جا کر اشتراکیت کی تبلیغ کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ مگر ایک مسلمان اتنے سازگار و مساعد حالات میں بھی زبان سے کلمہ حق نکالتے ہوئے اور نظریۂ خلافت الٰہیہ کی تبلیغ کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ حالانکہ دونوں نظریوں میں بہت بڑا فرق ہے نازیت، اشتراکیت وغیرہ کل غیر اسلامی نظریات کی حالت یہ ہے کہ انکی بنیادیں کھوکھلی اور کمزور ہیں، انکے فوائد سطحی، وقتی اور قلیل، انکے مضار و معائب بیحد و بیحساب، اور انکا نتیجہ آلام، مصائب، تباہیاں اور پریشانیاں۔ اسکے بالکل برعکس اسلامی نظریہ کی بنیاد مضبوط مستحکم اور ٹھوس منطقی دلائل پر قائم ہے، اسکے فوائد بے حد و حساب، اور مضرت سے اسکا دامن بالکل پاک ہے، اور اس کا نتیجہ دائمی امن و سلامتی ترقی و خوشحالی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے لیے اسکی ترویج ضروری ہو جاتی ہے نہ کہ کسی قومی عصبیت کی بنا پر۔ لاریب انتہائی ننگِ انسانیت اور حد درجہ بد دیانتی کا فعل ہوگا اگر ہم بنی نوع انسان کو گوناگوں مصائب دنیوی میں مبتلا اور ہلاکت و عذاب آخرت کی طرف جاتے ہوئے دیکھکر خاموش بیٹھے رہیں اور وہ نسخہ کیمیا ان کو نہ بتائیں جو فلاح و سعادت کا یقینی اور واحد ضامن ہے۔

ذیل کی سطور میں ہم خلافت اسلامیہ کا ایک مجمل خاکہ پیش کرتے ہیں اور دنیا کے ہر اس شخص کو اسکی طرف دعوت دیتے ہیں جس میں انسانیت کا ایک ذرہ بھی باقی رہ گیا ہے۔ خواہ

وہ جرمن ہو یا جاپانی، ترکی ہو یا ایرانی، اطالوی ہو یا برطانوی، ہندو ہو یا بودھ، عیسائی ہو یا یہودی یا دورِ موجودہ کا نسلی مسلمان خواہ کانگریسی ہو یا مسلم لیگی، ہم سب سے نہایت پُر زور الفاظ میں پورے علم ویقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ جمہوریت، نازیت، فاشیت، اشتراکیت وغیرہ کے طلسمات کو توڑ دو اور انسانی حاکمیت کو لات مار کر خدائے واحد قدوس کی حکومت اِس عالم آب و گِل میں قائم کر کے خلیفۃ اللہ فی الارض کا مرتبۂ عظمیٰ حاصل کرو۔ اور یہ سب ہم اپنے کسی ذاتی نفع کے لیے نہیں کہتے، کسی قومی عصبیت، کسی ملکی تعصب، کسی نسلی تفوق کی بنا پر نہیں کہتے، بلکہ محض تمہاری ہی ہمدردی کی بنا پر اور تم کو دنیا کی تباہی اور آخرت کے عذابِ الیم سے بچانے کے لیے کہتے ہیں۔ آئندہ تم کو اختیار ہے فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔

ریاست وحکومت کا اسلامی تصور جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے دنیا کے کل سیاسی تصورات سے بالکل انوکھا ہے۔ اسلام انسانی حکومت و فرمانروائی کا قائل نہیں ہے بلکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے اور محض قائم ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ تخلیق انسانی کی غرض وغایت اسی استخلاف فی الارض کو قرار دیتا ہے۔ قولہ تعالیٰ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ اس طرح وہ انسانیت کی قدر وعزت کو بلند ترین مرتبہ پر پہونچا دیتا ہے۔

اسلام کی روح ارتقاء وعروج ہے۔ مگر وہ وہمی اور عارضی ارتقاء نہیں جو غیر مسلمین کا نصب العین اور منتہائے فکر ہے بلکہ وہ ارتقاء جو گہوارہ سے شروع ہو کر عالمِ آخرت تک جاری رہتا ہے اور جس کی حد و نہایت متعین نہیں ہے۔ غیر اسلام میں ارتقاء وعروج کا تخیل بالکل محدود ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ انسان کی موت تک جاری رہتا ہے لیکن اسلام اسکو غیر محدود بتاتا ہے اور موت کے بعد (جو اسکے نزدیک فنا کا نہیں بلکہ حیاتِ ثانیہ کا نام ہے) بھی جاری

رہتا ہے۔

انسان اپنے ابتدائے وجود سے ایک راستہ پر گامزن ہوتا ہے جو مختلف منازل سے گذرتا ہوا منزل آخرت کو جاتا ہے۔ یہ راستہ ترقی کا راستہ ہے بشرطیکہ آدمی اسلامی اصول و قوانین کی پابندی کے ساتھ اس پر گامزن ہو۔ اسلامی اصول یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح اور کس نیت وغرض سے اس راستہ کی ہر چیز کو استعمال میں لایا جائے تاکہ ہر منزل ترقی وعروج کی منزل بن جائے۔ یہانتک کہ انسان ترقی کے اس اعلیٰ درجہ پر پہنچ جائے جسکا نام جنت ہے، جو اپنے علو و بلندی نیز دائمی وابدی ہونے کی وجہ سے منتہائے نظر ہونیکا مستحق ہے۔ تمدن وعمران کی ترقی، علوم وفنون کی ترقی، معاشی واقتصادی ترقی، اخلاقی ونفسیاتی ترقی، ذہنی وفکری ترقی، آلاتی و میکانکی ترقی، الغرض وہ کل ترقیاں اسلام کے مقاصد میں داخل ہیں جو حقیقت میں ترقیات ہوں نہ کہ تنزلات، جو انسان کو اوپر لے جائیں نہ کہ نیچے، جو ترقی کے مرتبہ اعلیٰ کے حصول کے لیے ذریعہ بن سکیں نہ کہ اسکی راہ میں حجاب ومزاحم بنجائیں، اور جو فلاح وسعادت کی موجب ہوں نہ کہ خسران وشقاوت کی۔

ترقی وعروج کی ان تمام اقسام کے حصول کے لیے یہ لازمی وضروری ہے کہ انسان کائنات کا صحیح استعمال کرے، ہر چیز کے مفید پہلو سے فائدہ اٹھائے اور مُضر پہلو سے اجتناب کرے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ انسان اپنے صحیح مرتبہ اور دوسری مخلوقات عالم کے صحیح درجہ سے واقف ہو، پھر کچھ ایسے قوانین کا پابند ہو جو تمدن وعمران، معاش واخلاق، ذہانت وتفکر، علم وادراک کے ان منازل ارتقاء کو باقی رکھ سکیں جو انسان کو حاصل ہو چکے ہوں اور ان مراتب کو آئندہ مراتب ارتقاء کے حصول کا ذریعہ بنا سکیں۔

"خلافت الٰہیہ" کا نظریہ ارتقاء وعروج کے ان دونوں ضروری عناصر کو مجتمع کر دیتا ہے

انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض قرار دے کر اسلام نے ایک طرف تو کائنات میں انسان کی صحیح حیثیت اور موجودات کے ساتھ اسکے تعلق کی صحیح نوعیت متعین کر دی ہے، اور دوسری طرف اسکے لیے موجودات میں تصرف کا صحیح طریقہ بھی معین کر دیا ہے، کیونکہ جب انسان اللہ کا خلیفہ ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ یہاں مالکِ مختار کی حیثیت سے کوئی تصرف کرنیکا مجاز نہیں ہے بلکہ اسے تمام تصرفات اصل مالک کے مقرر کیے ہوئے قانون کے مطابق کرنے چاہییں۔ خلیفۃ اللہ ہونے کے بعد انسان سمجھتا ہے کہ کل کائنات عالم اسکے فائدہ اور نفع کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اُس کا یقین "وَخَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" اور "وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ" اور اسی قسم کے دوسرے پیغاماتِ الٰہیہ پر ہوتا ہے۔ اسلیے وہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ پر غائر نظر ڈالتا ہے، عالم خلق کے چپہ چپہ کو کھنگال کر استعمال میں لاتا ہے تاکہ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" کے مفہوم پر عمل ہو جائے۔ پھر وہ اس سب مخلوقات کو ارتقاء کے مرتبہ عظمیٰ یعنی ترقی آخرت کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بناتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدن و عمران، علوم و فنون، فکر و ادراک، غرض ہر میدان میں پیش قدمی کا صحیح رخ متعین ہو جاتا ہے۔

نظریۂ خلافت انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان نوعیت کا فرق قائم کر دیتا ہے۔ دوسری مخلوقات کے لیے صرف قانون طبیعت (Law of Nature) کی پیروی ہے، اور اس پیروی میں ان کے لیے محض جبلّت (Instinct) کی ہدایت کافی ہے۔ لیکن انسان ان کے برعکس خلیفہ یا نائب کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو دوسری مخلوق پر تصرف کے اختیارات دیے گئے ہیں، اس کو تمیز اور استدلال اور استنتاج اور تفکر کی قوتیں دی گئی ہیں، اور وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا ذمہ دار و جواب دہ عہدہ دار ہے، اس لیے اس کا کام محض تکوینی قوانین اور طبیعی اصول کی پیروی نہیں ہے، بلکہ اُن سے زائد ایک تشریعی قانون، ایک اخلاقی ضابطہ اور ایک جلی ہدایت

کی پیروی کرنا بھی اس پر لازم ہے، بلکہ اسکی فلاح و سعادت کا انحصار اسی دوسری چیز کی پیروی پر ہے۔ اسکی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکومت کی سول سروس کا کام محض اُن قوانین کی پیروی کرنا ہی نہیں ہے جو عام رعایا کے لیے بنائے گئے ہوں، بلکہ ان کو حکومت بالادست کی ہدایات اور ضابطۂ ملازمت Government Servants Conduct Rules) کی پیروی بھی کرنی پڑتی ہے، اور ان کی کامیابی و ترقی کا انحصار دراصل اسی دوسری چیز کی پیروی پر ہوتا ہے۔ پس انسان کے لیے محض قوانین تکوینیہ کی اساس پر سعی و عمل اور ترقی و عروج کا کوئی ایسا پروگرام اور نظام نہیں بنایا جاسکتا جو سفرِ زندگی کی ہر منزل اور حیات کے کل شعبوں میں اسکی رہنمائی کے لیے کافی ہو، اور جسکا اتباع کرکے آدمی ترقی کی دنیوی منزلوں سے سلامتی کے ساتھ گذرتا ہوا آخرت کی انتہائی منازل ترقی تک پہنچ سکے۔ اسکی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ عالم خلق میں سرے سے وہ ضروری مواد Data ہی موجود نہیں ہے جس سے آدمی بطور خود اس پروگرام اور نظام کو اخذ کرسکے، اور اسکی وجہ صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ آدمی کے ذرائع استدلال و استنتاج اس ضابطہ کو معلوم کرنے کے لیے ناکافی ہیں، بلکہ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سفرِ زندگی کی آخری منزل جس کے نتائج پر ہماری کامیابی و ناکامی اور ترقی و تنزل کے اصلی فیصلہ کا دارمدار ہے، ہماری نگاہ سے قطعی اوجھل ہے اور ہم بطور خود کسی طرح بھی یہ نہیں جان سکتے کہ وہاں ہمارے کس دنیوی عمل کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ لہذا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان کو زمین پر اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے لیے جس پروگرام اور نظام کی ضرورت ہے وہ لازماً خداوند تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت یا بالفاظِ دیگر وحی کے طور پر آنا چاہیے۔

اس طرح انسانی ارادہ ارادۂ الٰہی کے، اور انسانی تعقل علمِ الٰہی کے تابع ہو جاتا ہے جسکا ایک اثر تو یہ ہوتا ہے کہ انسان کی قوتِ ارادی اور قوتِ تصرف میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے

کیونکہ ہر قدم پر وہ محسوس کرتا ہے کہ فرمانروائے عالم کی طاقت اسکی پشت پر ہے۔ دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ ترقی کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے، کیونکہ ہر اساسی اہمیت رکھنے والے مسئلے میں انسان کو صحیح رہنمائی مل جاتی ہے اور اسکی قوت غلط تجربات میں ضائع نہیں ہوتی۔ تیسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان ان تمام نقصانات سے محفوظ رہتا ہے جو انسانی حاکمیت کے بے اصل مفروضہ پر کام کرنے کی صورت میں لازماً پہنچتے ہیں۔ اس میں نہ طبقاتی کشمکش ہوتی ہے نہ سرمایہ دار و مزدور کی آویزش نہ پارٹی بندیاں ہوتی ہیں نہ فرقہ پرستیاں، نہ خونریزیاں ہوتی ہیں نہ ہلاکت آفرینیاں، اسلیے کہ یہ سب تو انسانی حکومت کے نتائج ہیں، حکومت الٰہیہ میں انکا وجود کہاں؟ ان خرابیوں کے بالکل برعکس وہاں ایک ایسے تمدن کی تعمیر ہوتی ہے جسکا ہر جزو انتہائی ترقی یافتہ اور جس کا ہر حصہ امن و سلامتی اور راحت و اطمینان کا ضامن ہوتا ہے۔

آزادی و مساوات کا حقیقی وجود صرف حکومت الٰہیہ ہی میں ممکن ہے، اسلیے کہ وہاں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کے خیالات، اعمال و افعال کسی فرد یا جماعت کے تابع نہیں ہوتے، بلکہ صرف حق تعالیٰ جل شانہ، کے احکام و تعلیمات کے تابع ہوتے ہیں۔ اخلاق کے حسن و قبح کو تمدن کے فنا و بقا میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسلامی حکومت کی بنیاد ہی اصلاح اخلاق پر قائم ہے۔ حکومت الٰہی نہ صرف یہ کہ اظہار گناہ سے مانع ہوتی ہے بلکہ اندھیری کوٹھڑی میں بھی برے اخلاق و افعال کے ارتکاب کو روکتی ہے۔ گناہوں کی روک تھام وہاں ظاہر ہی میں نہیں ہوتی بلکہ باطن میں بھی ہوتی ہے، اسلیے کہ خدا کی حکومت اُن اخلاقی بنیادوں کو منہدم کر دیتی ہے جن پر بدکرداریوں کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست میں قانون سازی کے اختیارات انسان کو نہیں حاصل ہوتے، نہ کسی فرد کو نہ کسی جماعت کو، بلکہ سب کو قانونِ الٰہی کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ اسکا ایک بہت بڑا فائدہ

یہ ہوتا ہے کہ حکومت اور پبلک میں یک جہتی اور باہمی تعاون و ہمدردی کی روح پیدا ہو جاتی ہے جس سے ریاست دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی ہے۔ علاوہ بریں قوانین کے اجراء و تنفیذ میں کوئی دشواری نہیں پیدا ہوتی اسلیے کہ سوسائیٹی کے افراد میں اطاعت کا داعیہ خود موجود ہوتا ہے اور قانون الٰہی کی اطاعت کی جانب اس عام رجحان کی وجہ سے جو فضا پیدا ہوتی ہے اس میں خود بخود مطیع اور پابندِ قانون اشخاص پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

قانون کے اجراء و تنفیذ کے اختیارات بے شک ہیئت انتظامیہ، یعنی حکومت ہی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اور حکومت میں بھی ایک شخص، یعنی خلیفہ یا امیر کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے، لیکن سب سے بڑا بنیادی فرق جو اس حکومت کو دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں حکومت ایک متقی سوسائیٹی کے اندر بنتی ہے اور انتظامی کاموں کے لیے عاملین کا انتخاب اہلِ تقویٰ لوگوں میں سے کیا جاتا ہے۔ برعکس اسکے دوسری حکومتیں اُس سوسائیٹی میں بنتی ہیں جس میں تقویٰ کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ اس فرق کی وجہ سے انتظامی اختیارات ایک شخص یا چند اشخاص کے ہاتھ میں دینے کے جو نتائج غیر متقی سوسائیٹی میں ظاہر ہوتے ہیں وہ متقی سوسائیٹی میں ظاہر نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ اختیارات جو عاملین حکومت کو دیے جاتے ہیں، یہ بھی غیر محدود نہیں ہیں۔ جن امور میں شرع کے احکام صریح ہیں ان میں حکومت کی حیثیت ایک آلۂ تنفیذ سے زیادہ نہیں ہے۔ اور جو امور ان کے ماسویٰ ہیں ان میں اول تو حکومت کو مشورے کا پابند کیا گیا ہے، دوسرے اسلامی شعور رکھنے والی پبلک کو محاسبہ اور تنقید کے پورے اختیارات دیے گئے ہیں۔ اسلام لوگوں میں یہ اسپرٹ پیدا کرتا ہے کہ وہ حکمرانوں کے اعمال کو غور سے دیکھتے رہیں۔ جب تک وہ خدا اور رسول کی ہدایت پر چل رہے ہوں، اُنکی پوری اطاعت کریں، جب اُن کا

روِیہ مشکوک ہو تو محاسبہ کریں، تنقید اور نصیحت سے اصلاح کی کوشش کریں، اور جب انکو اتنا منحرف پائیں کہ دین میں فساد کا خطرہ ہو تو انہیں معزول کر دیں۔

خلافت الٰہیہ کا مقصد مندرجہ بالا سطور پڑھنے کے بعد قیام خلافت الٰہیہ کا مقصد خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ لیکن ہم اسکے ماخذ کے ساتھ اسکا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ شک و ریب کی گنجائش نہ رہے۔ قرآن مجید مندرجہ ذیل الفاظ میں خلافت اسلامیہ کے مقاصد کا تذکرہ کرتا ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ	(وہ لوگ ایسے ہیں) کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کرینگے اور زکوٰۃ دینگے اور اچھے کاموں کا حکم کرینگے اور برے کاموں سے روکینگے۔

اس آیت میں قیام خلافت کے چار مقاصد بیان کیے گئے ہیں: اقامتہ صلوٰۃ۔ ایتاء زکوٰۃ امر بالمعروف۔ نہی عن المنکر۔ اقامتہ صلوٰۃ سے مراد صرف نماز ہی پڑھنا نہیں ہے بلکہ کل عبادات بدنیہ اپنے اپنے درجات کے اعتبار سے اس میں داخل ہیں۔ اسی طرح ایتاء زکوٰۃ سے مراد محض زکوٰۃ دینا ہی نہیں ہے بلکہ پورے معاشی نظام کو اسلامی معیار و اصول پر قائم کر دینا بھی اس میں داخل ہے۔ رہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تو پہلے ترقی کی حقیقت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے پیش نظر رکھ کر سمجھا جاسکتا ہے کہ ہر معروف انسان کی حقیقی ترقی میں معاون اور ہر منکر اسکی ترقی میں مانع ہے۔ پس دوسرے الفاظ میں خلافت الٰہیہ کے قیام کے مقاصد یہ ہیں: عبد و معبود کے تعلق کو مضبوط و مستحکم بنانا اور بنی نوع انسان کو صحیح معنوں میں خداوند عالم کا بندہ بنانا دنیا کے معاشی نظام کو درست کر کے ایسی حالت پر قائم رکھنا جس میں نہ جماعتی قارونیت کا وجود ہو سکے نہ شخصی قارونیت کا، اور نہ فاقہ کشی و غربت کے دلگداز نظارے دیکھنے میں آئیں۔

نوعِ انسانی کو ہر شعبہ زندگی میں ارتقاء و عروج کی طرف بڑھانا اور اس راہ میں جو موانع ہوں انکو دور کرنا۔

خلافت الٰہیہ کا مفہوم اور مقصد معلوم کرنیکے بعد غالباً مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی وہ غلط فہمیاں رفع ہو جائینگی جو وہ تحریک اسلام اور اسلامی ریاست و حکومت کے متعلق رکھتے ہیں۔ غیر اسلامی ماحول میں عرصہ دراز سے پرورش پانے کی وجہ سے غیر مسلم تو غیر مسلم، خود مسلمان بھی اسلامی حکومت کے متعلق بہت زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ عوام تو عوام خود علماء اسلام میں بھی ریاست کے اسلامی تصور اور اسکے اصول و مقاصد پر نظر رکھنے والے شاذ و نادر ہی ہونگے۔ مسلمانوں کے ذہن میں اسلامی حکومت کا جب تصور آتا ہے تو انکی آنکھوں کے سامنے زمانہ سابق کے مسلمان بادشاہوں کی مطلق العنان فرمانروائی، یا زمانۂ حال کے اتاترک اور عصمت اینونو کی جمہوریت کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ ہم حاکمِ مطلق ہونگے خوب دادِ عیش دینگے اور ہمارے ماتحت جو قومیں ہونگی انکے ساتھ جو چاہینگے سلوک کرینگے۔ حالانکہ اسلامی حکومت کا اگر یہ مفہوم ہو تو اس میں اور غیر اسلامی حکومت میں کوئی فرق نہیں۔ یہی غلط فہمی ہے جسکی بناء پر ہندوستان کا مسلمان یہ احمقانہ خیال رکھتا ہے کہ غیر اسلامی طریقے اختیار کرکے، شعائر اسلامی کو پامال کرکے، مغربی معاشرت و تمدن اختیار کرکے، عورتوں اور مردوں کی مخلوط تعلیم رائج کرکے، بے حیائی و بے غیرتی کی اشاعت کرکے، اور سر سے پیر تک غیر اسلامی بنکر بھی وہ اسلامی حکومت قائم کرسکتا ہے۔ رہے غیر مسلم تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کے معنی مسلمان نامی ایک قوم کے دوسری قوموں پر حکمراں بن جانے کے ہیں۔ یہ ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت و [illegible] ہی ایک بدمزہ چیز ہے جس کا کوئی بھی برضا و رغبت خیر مقدم نہیں کرسکتا۔ مگر جب وہ اپنے ہمسایہ مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کو دیکھتا ہے تو اس خیال سے اسکی روح کانپ

جاتی ہے کہ یہ مالک الملک اور ہم رعیت ہوں تو ہمارا حشر کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو اخلاق و اعمال ہندوؤں اور سکھوں اور دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں انکو دیکھتے ہوئے کوئی غیر قوم ہندو یا سکھ حکومت کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی۔ بالکل اسی طرح اسلامی حکومت کو مسلمانوں کی قومی حکومت، اور وہ بھی ان مسلمانوں کی حکومت سمجھنے کے بعد غیر مسلموں میں اس سے وحشت بلکہ نفرت ہونا کوئی خلافِ توقع امر نہیں ہے۔

ان غلط فہمیوں نے تحریک اسلام اور دعوتِ خلافت الٰہیہ کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ گذشتہ سطور ان غلط فہمیوں کو دور کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ مگر یاد دہانی کے طور پر میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں اور مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو اچھی طرح اس سے واقف ہو جانا چاہیے کہ اسلامی حکومت کے معنی مسلمانوں کی حاکمیت (Sovereignty) کے نہیں ہیں۔ مسلمانوں کی حاکمیت اسی طرح اور اسی قدر ناجائز اور خلافِ حق و انصاف ہے جس قدر غیر مسلموں کی حاکمیت۔ اسلام سرے سے انسانی حاکمیت ہی کا مخالف ہے۔ اس کا مدعا تو اللہ کی حاکمیت قائم کرنا ہے اور اس اصل الاصول کے خلاف جہاں جو حکومت بھی ہو وہ اسکو غلط کہتا ہے خواہ وہ کسی مسلمان بادشاہ یا رئیس کی حکومت ہو یا غیر مسلم راجہ اور قیصر کی، اور خواہ وہ کسی مسلمان قوم کی حکومت ہو یا غیر مسلم قوم کی۔ درحقیقت اسلامی حکومت نام ہے ان اصول و قوانین کی حکومت کا جو حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی فلاح و ترقی کے لیے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے انسان کو تعلیم کیے ہیں۔ اور اسلامی حکومت کی جانب دعوت دینے کا مطلب انہی اصول و قوانین کی جانب دعوت دینا ہوتا ہے نہ کہ مسلمانوں کی غلامی اور ماتحتی کی جانب۔ ہم غیر مسلموں کو اپنے ماتحت لانا نہیں چاہتے نہ ہم اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہم تو چند اصول و قوانین کی تبلیغ کرتے ہیں اور انکے مطابق اپنی اور

دوسروں کی زندگی کو ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ اصول اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ہیں اسلیے دوسرے الفاظ میں ہم دنیا کے ہر انسان کو دوسرے انسانوں کی اور خود اسکے اپنے نفس کی غلامی سے آزادی دلاکر اللہ تعالیٰ کی حکومت میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہم میں اور غیر مسلموں میں جو فرق نظر آتا ہے وہ اسلیے ہے کہ ہم داعی ہیں اور وہ مدعو۔ لیکن جب وہ ان اصولوں کو قبول کرکے ان پر عمل پیرا ہو جائینگے تو ہم اور وہ مساوی ہو جائینگے، بلکہ ممکن ہے کہ انفرادی حیثیت سے موجودہ دور کے نسلی مسلمان سے وہ اشخاص اور جماعتیں ترقی و عروج میں بازی لیجائیں جو اسلام کے اصول و قوانین کو بعد میں قبول کریں۔ ان اصول و قوانین کے منافع کسی نسل و وطن، قوم و قبیلہ کے ساتھ مقید و محدود نہیں ہیں۔ دنیا کی ہر قوم و ہر نسل کے اشخاص اس سے یکساں طور پر منتفع ہو سکتے ہیں۔ جس طرح ان سے عبداللہ و عبدالرحمٰن ترقی و فلاح حاصل کر سکتے ہیں اسی طرح ان پر عمل کرکے گاندھی و جواہر لال بھی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

پھر ہماری یہ دعوت کسی تعصب، کسی عناد، کسی مجادلہ و مقابلہ کے لیے نہیں ہے بلکہ محض بنی نوع انسان کی فلاح اور بلندی و ترقی کے لیے ہے۔ دشمنی کے بجائے انکی ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ اس دعوت کا محرک ہے۔ اور اسکی بنیاد محض جذبات پر قائم نہیں ہے بلکہ قوی و مستحکم عقلی و خبری دلائل پر قائم ہے جو ہر صحیح الفطرت اور سلیم العقل انسان کو اپیل کر سکتے ہیں۔

جالندھر میں ہماری ایجنسی

جالندھر میں رسالہ ترجمان القرآن اور تالیفاتِ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایجنسی قائم کر دی گئی ہے

ضرورت مند حضرات ذیل کے پتہ سے ہمارا شائع کردہ لٹریچر حاصل کر سکتے ہیں۔

پبلک بک ڈپو۔ رینک بازار۔ جالندھر